پروفیسر آل احمد سرور کی اقبال شناسی

عرفان اقبال کی روشنی میں

ساجدہ پروین
لیکچرار اردو
گورنمنٹ کالج برائے خواتین، شورکوٹ سٹی

AAL E AHMAD SAROOR
AS AN IQBAL SCHOLAR

Sajida Perveen
Lecturer in Urdu
Govt. College (W) Shorkot City

Abstract

Aal e Ahmad Saroor is a renowned Iqbal scholar. His book Irfan e Iqbal is a collection of twelve important essays on Iqbalyaat. He often focuses Iqbal's terminology, use of allusions, philosophy of elevation and down fall and his approach on current affairs as his subject of discussion. He not only raises variety of questions related to Iqbal but also provides answers to them. He lays emphasis on Iqbal's universal vision, his stress on human dignity, self realization, self recognition and self expression. He tries to highlight Iqbal's features with great subtlety. He presents an objective, balanced and justified picture of Iqbal's poetry.

Keywords:

اقبال، آل احمد سرور، زہرا معین، رُوح اقبال، شاعر، مفکر، ملوکیت، سندھ، کراچی، خطیب

پروفیسر آل احمد سرور کو اقبال شناسی میں ایک نمایاں، اہم اور منفرد مقام حاصل ہے۔ "عرفانِ اقبال" ان کے اقبال سے متعلق بارہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اسے پروفیسر زہرا معین نے پہلی بار ۱۹۷۷ء میں مرتب کیا تھا۔ اس مجموعے کا دوسرا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے شائع ہوا۔(۱) یہ مجموعہ اقبال کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ سرور صاحب کے گہرے تنقیدی شعور اور ارتقا کا پتا دیتا ہے۔

"عرفانِ اقبال" کے بارے میں پروفیسر محمد سعید لکھتے ہیں:

> "عرفانِ اقبال میں شامل مضامین اپنی انفرادیت اور معنویت کے لحاظ سے بے حد اہم ہیں۔ سرور صاحب کے ہاں کثرت سے مغربی مصنّفین کے حوالے آئے ہیں انھوں نے مغربی مصنّفین ہی کو اپنا رہنما نہیں بنایا۔ ان کے ہاں جہاں ملٹن، نیٹشے، برگساں، لینن، گوئٹے، شیلے اور بائرن وغیرہ کے حوالے آئے ہیں وہاں رومی، سعدی، حافظ، میر، غالب، حالی اور اکبر وغیرہ بھی ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔"(۲)

سرور صاحب نے اقبال کو دریافت کرنے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔ اقبال پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے مُدّت العمر کے غور و فکر کا حاصل ہے۔

"عرفانِ اقبال" کے مضامین ترتیب وار یہ ہیں:

۱۔ جبریلِ مشرق
۲۔ اقبال اور ابلیس
۳۔ اقبال اور اس کے نکتہ چیں
۴۔ اقبال اور اُن کا فلسفہ
۵۔ رُوحِ اقبال
۶۔ خطوط میں اقبال کی شخصیت
۷۔ اقبال کے خطوط
۸۔ اقبال کی عظمت
۹۔ اُردو غزل ۔۔۔ میر سے اقبال تک
۱۰۔ اقبال اور مغرب
۱۱۔ اقبال کے اِستعارے
۱۲۔ اقبال اور جمہوریت

یہ مضامین اِس کتاب میں شائع ہونے سے پہلے مختلف ادبی رسالوں اور سرور صاحب کے تنقیدی مجموعوں میں شائع ہو چکے تھے۔ پروفیسر زہرا معین ان مضامین کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''سرور صاحب کے ان مضامین کے مطالعے سے ہمیں اقبال کے پیغام کی رُوح تک پہنچنے، ان کی شخصیت کے خط وخال کو پرکھنے اور ان کے فن کے رمز وایما سے آشنا ہونے میں مدد ملتی اور بحیثیت مجموعی اقبال کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔''(۳)

''جبریلِ مشرق'' علامہ اقبال سے متعلق آل احمد سرور کا پہلا مضمون ہے۔ یہ ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا اور جنوری ۱۹۳۶ء کے رسالہ ''سہیل'' علی گڑھ میں شائع ہوا۔(۴) یہ مضمون درحقیقت اقبال کے اُردو مجموعہ کلام ''بالِ جبریل'' پر تبصرہ ہے۔

مضمون کے شروع میں سرور صاحب نے خوشی کا اظہار کیا ہے کہ عصرِ حاضر کے سب سے بڑے شاعر یعنی اقبال نے اُردو زبان میں شاعری کرنے کو خیر باد نہیں کہا بلکہ 'بالِ جبریل' کے کلام کے تیور بتا رہے ہیں کہ 'بطنِ گیتی'' سے اور ''آفتابِ تازہ'' پیدا ہونے والا ہے۔ مضمون کے پہلے چھ صفحات میں اقبال سے متعلق جنم لینے والے شکوک وشبہات کا ذکر ہے اور ان کے اسباب وعلل معلوم کر کے ان شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں:

> ''اقبال مفکر بھی ہے اور شاعر بھی، خطیب بھی اور مغنی بھی۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی میں اور سیاسیات کی دُنیا میں وہ رجعت پسند ہیں۔ بظاہر اس تفاوت کا اثر ہماری اجتماعی زندگی پر اچھا نہیں پڑا۔ ایک طرف شعرا کی نیت میں شبہ ہونے لگا ہے اور دوسری طرف دُنیائے فکر وعمل میں ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہوگئی ہے۔''(۵)

شاعر کا نصب العین زندگی کی جدوجہد اور ارتقا کی صبر آزما منازل سے بچ کر تخیل کی فضاؤں میں پرواز کرنا اور اِس طرح غذائے رُوح فراہم کرنا ہے۔ یہ چیز چاہے کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہو اسے عملی زندگی کی جانبازیوں سے کوئی غرض نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اقبال اور اس کی شاعری میں ذرا بھی تفاوت نہیں رہتا۔

اقبال دُنیا کی پستیوں کا قائل نہیں۔ فضاؤں میں پرواز اس کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اس کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ بعض چیزیں اسے خاص طور پر متاثر کرتی ہیں۔ محمود وایاز، سومنات، شاہین اور خودی اس کے کلام میں بار بار آتے ہیں مگر ان میں سے وہ شاہین سے خاص طور پر متاثر ہیں اور مختلف نظموں اور غزلوں میں اسے تشبیہی مترادف بنایا ہے۔ اقبال اگرچہ ''نور ونغمہ'' کی فضاؤں میں محوِ پرواز ہے لیکن اپنے گردوپیش کا جائزہ بھی لیتا جاتا ہے اور جوبات اہم نظر آتی ہے، اشعار میں بیان ہوتی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقِ جذبات، جوشِ قلب، سوز وگداز اور درد واثر صرف عشق ومحبت کے جذبات کی عکاسی سے

ہی نہیں، اس دُنیا کی ہر چیز سے پھوٹ سکتے ہیں۔ حُسنِ خیال، حُسنِ نظر اور حُسنِ ادا صرف ہجر و وصل کے مسائل کے لیے ہی نہیں، مشکلاتِ انسانی کو حل کرنے کے لیے بھی صرف ہو سکتے ہیں۔ بانگِ درا اور بالِ جبریل کے شاعر میں فرق واضح کرتے ہوئے سرور صاحب کہتے ہیں:

> ''اگرچہ ''آبِ روانِ کبیر'' کے کنارے خواب شروع سے دیکھے جاتے ہیں۔ ''خاکِ مدینہ و نجف'' روزِ اوّل سے آنکھ کا سُرمہ ہے اور تہذیبِ حاضر کی چمک ابتداء سے نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے مگر جوش کی جگہ سنجیدگی نے، خندۂ دنداں نما کی جگہ ایک لطیف تبسم نے اور شعلہ جوالہ کی برق سامانیوں کی جگہ ایک مسلسل، متوازی اور محیط ضیاء باری نے لے لی ہے۔۔۔ تخیل جو پہلے فضاؤں میں رقص کرتا تھا، الفاظ میں ناچ رہا ہے، نشہ اُتر گیا ہے اور اس کی جگہ ایک ہلکی لطیف کیفیت نے لے لی ہے۔ اب وہ طوفانی خروش نہیں، الفاظ کوٹ میں ڈھلے ہوئے، نگینہ میں جڑے ہوئے نکلتے ہیں۔''(۶)

اس مضمون کے مندرجات سے پتا چلتا ہے کہ سرور صاحب کا مطالعۂ اقبال نیم پختہ ہے۔ اس کا ثبوت اس خط سے بھی ملتا ہے جو اقبال نے سرور صاحب کے خط کے جواب میں لکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرے کلام کا بھی بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا۔۔۔ میں آپ کو یہ دوستانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اس طرف بھی توجہ کریں کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سی باتیں خود بخود آپ کی سمجھ میں آ جائیں گی۔''(۷)

سرور صاحب نے بعد میں اقبال کی اس بات کو حرزِ جاں بنایا اور تمام عمر کلامِ اقبال کی تفہیم میں صرف کر دی۔ اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ اس مضمون کے زمانۂ تصنیف میں اُن کی توجہ اقبال کے جن گوشوں کی طرف مرکوز ہوئی بعد میں وہی گوشے ان کے باقاعدہ موضوع بنے لیکن اس مضمون کی تاریخی حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی کیونکہ یہ مضمون اقبال کی زندگی میں لکھا گیا اور یہ سرور صاحب کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔

''اقبال اور ابلیس'' سرور صاحب کا دوسرا مضمون ہے جو اقبال کی زندگی میں لکھا گیا اور ہندوستانی اکیڈمی یو پی کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ انھوں نے اقبال کا تصورِ ابلیس پیش کرنے کے لیے بڑا جامع پس منظر تیار کیا ہے۔ اس مضمون کی تمہید غیر متناسب معلوم ہوتی ہے تقریباً دس صفحات کے بعد وہ اصل موضوع پر آتے ہیں۔ مضمون کا قابلِ قدر حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے مغربی ادبیات کے حوالے سے ابلیس کا تصور پیش کیا ہے اور اس کے کردار کی خصوصیات کی تشریح و توضیح کرنے کے بعد اقبال کی اُردو اور فارسی نظموں کے حوالے دیے ہیں لیکن یہاں ایک کمی محسوس ہوتی ہے کہ اس میں ملٹن کے اقبال پر اثرات پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ گوئٹے کے اثرات کو مناسب اہمیت نہیں دی گئی اور نہ ہی اقبال کے یہاں اس رومانیت پر، جس کی ایک علامت ابلیس ہے،

اس مضمون میں وحدتِ تاثر کا بھی فقدان ہے۔مضمون کے آخری حصہ میں سرور صاحب نے بحیثیت مجموعی ابلیس سے متعلق اقبالؔ کا خاص تصور واضح کیا ہے۔اقبالؔ کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کی اہمیت واضح کرتے ہوئے سرور صاحب فرماتے ہیں:

''اقبال کے سیاسی فکر کا ارتقا اس سے بخوبی سمجھ آ جاتا ہے۔اقبالؔ شہنشاہیت، غلامی، ملوکیت، فاشزم کو ابلیسیت بتاتے ہیں اور جمہوریت، اِشتراکیت، اسلام کو عین انسانیت اور اگر چہ وہ اِشتراکی کو چہ گردوں کے بہت زیادہ قائل نہیں،مگر پھر بھی ابلیس کے لیے ایک خطرہ سمجھتے ہیں۔ ابلیس کی زبان سے انھوں نے جدید اسلام کے مسائل کا بہت کامیاب تجزیہ کیا ہے۔''(۸)

سرور صاحب کے اِس مضمون کا طریق پیشکش مختلف اور منفرد ہے۔انھوں نے صاف ستھری اور شفاف زبان میں اقبالؔ کے تصورِ ابلیس پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

''اقبال اور اس کے نکتہ چیں'' سرور صاحب کا اقبال سے متعلق تیسرا مضمون ہے۔۱۹۳۸ء میں اقبالؔ کے اِنتقال کے بعد مولوی عبدالحق نے ''اُردو'' اورنگ آباد کا اقبال نمبر نکالنا چاہا تو انھوں نے سرور صاحب سے فرمائش کی کہ اقبال سے متعلق ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیں جو قدیم اور جدید تنقید نے پیدا کر دی تھیں، چنانچہ انھوں نے یہ مضمون لکھا۔

آل احمد سرور کے اس مضمون کی اقبالیات میں بڑی شہرت اور اہمیت ہے۔اِس مضمون نے اِنتہاپسندی کے دور میں تنقید کے ایک نئے رُخ کی طرف اِشارہ کیا۔انھوں نے ان تمام اعتراضات کا دلائل کے ساتھ جواب دیا ہے جو اقبال پر مختلف حلقوں کی طرف سے کیے گئے اور جن کی بازگشت اب بھی ڈھکے چھپے انداز میں کبھی کبھار سنائی دے جاتی ہے۔سب سے پہلے انھوں نے اِن اعتراضات کا ذکر کیا ہے جو اقبالؔ کی زبان سے متعلق تھے۔وہ لکھتے ہیں:

''اقبال نے بہت سی انوکھی ترکیبیں وضع کی تھیں۔بہت سے نئے اِستعارے اور تشبیہات پیش کیے تھے، جو کانوں کو اجنبی معلوم ہوئے۔ان کا حسن بعض نگاہوں میں نہ جچا۔''(۹)

''نئی زبان اِستعارات سے بنتی ہے۔کم از کم اس کے سانچے اسی طرح تیار ہوتے ہیں۔خیال کو نئی راہیں ملتی ہیں، ذہنی فضا وسیع ہوتی ہے زبان آگے قدم بڑھاتی ہے۔۔۔میرؔ، داغؔ، ذوقؔ زبان کو محفوظ کرنے والے ہیں، غالبؔ، اقبالؔ، انیسؔ زبان کو آگے بڑھانے والے ہیں۔۔۔ جب کوئی اِستعارے اور تشبیہات اِستعمال کرتا ہے تو کہیں کہیں اس انداز میں ایک اجنبیت آ جاتی ہے۔اس کے خیال کے سانچوں اور علامتی مترادفات سے لوگ پوری طرح واقف نہیں ہوتے۔اسی وجہ سے قواعد کی رو سے اعتراضات پیش کرتے ہیں، حالانکہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ

اقبالؔ اور غالبؔ کا کام قواعد کی پابندی نہیں، گر یہ کا کام ہے کہ ان اشخاص کی مقرر کردہ
شاہراہوں پر چلے۔"(۱۰)

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اقبال کی زندگی اور شاعری میں تضاد ہے جو لوگ اقبال پر یہ اعتراض کرتے ہیں۔وہ زیادہ تر ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۲ء تک کے دور پر نظر رکھتے ہیں۔۱۹۲۴ء میں اقبالؔ کو"سر" کا خطاب ملا، پھر وہ پنجاب کونسل کے رُکن منتخب ہوئے۔۱۹۲۸ء میں انھوں نے سائمن کمیشن سے تعاون کیا۔۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے اِنگلستان گئے۔سرور صاحب اس اعتراض کا جواب یوں دیتے ہیں:

"اقبال کی ۶۱ سالہ زندگی میں صرف ۸ سال ایسے نکلتے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان کی شاعری کے عام رُجحان سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔اس کی بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ عام طور پر اقبال کی زندگی اور ان کی شاعری میں حیرت انگیز یگانگت پائی جاتی ہے اور تھوڑے سے عرصے کو چھوڑ کر جب ان کے قدم ذرا متزلزل ہو گئے تھے، ساری عمر وہ اسی راستے پر گامزن رہے جو ان کی شاعری کا تھا۔"(۱۱)

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اقبال کی شاعری مقامی و محدود ہے۔یہ خیال کس قدر مضحکہ خیز ہے۔اقبال عالمگیر انسانیت کا خواب دیکھتے ہیں، انھوں نے فارسی میں اس وجہ سے شعر کہنے شروع کیے کہ وہ ہندوستان سے باہر تمام عالمِ اسلامی تک اپنی آواز پہنچانا چاہتے تھے۔وہ وطن پرستی کے نہیں وطن دوستی کے علمبردار ہیں۔اقبالؔ کی شاعری پر ایک اعتراض یہ ہے کہ یہ خیالی ہے اور بے عملی کی طرف لے جاتی ہے۔ سرور صاحب کہتے ہیں:

"جس نے شاعری کو خیالی فضاؤں سے نکال کر عمل کی دُنیا کی سیر کرائی، جس نے زندگی کے مسائل، جہالت، غربت، غلامی کی طرف اپنے سامعین کو متوجہ کیا، جس کے تخیل کی رنگ آمیزی سے زندگی کی تصویر اور بھی شوخ ہو گئی۔اس کی شاعری کو خیالی کہنا ہرگز صحیح نہیں۔"(۱۲)

اقبالؔ پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ ماضی کے شاعر ہیں۔اقبالؔ جتنے ماضی کے شاعر ہیں، اتنے ہی حال اور مستقبل کے شاعر ہیں۔اقبالؔ نے زمانے کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا۔وہ تو زمان و مکاں کو ایک عارف کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے سامعین کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ان پر تو رجعت پسندی کا الزام عائد ہی نہیں ہو سکتا۔یہ مضمون بہت قابلِ قدر ہے اس میں سرور صاحب کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اقبال پرستی اور اقبال دُشمنی کے درمیان اقبال شناسی کا پُل تعمیر کیا۔

"اقبال اور ان کا فلسفہ" یہ مضمون ۱۹۳۹ء میں تحریر کیا گیا۔بنیادی طور پر یہ مضمون ایک ریڈیائی تقریر ہے۔اس مضمون کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ سرور صاحب کو اقبال کے فکر و فن سے گہری واقفیت ہو چکی ہے اور انھیں رموزِ اقبال کو سہل، سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کرنے پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہو گئی ہے۔

سرورصاحب اقبالؔ کے فلسفۂ خودی کورومانویت کا حصہ قرار دیتے ہیں اورواضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ خودی عشق ومحبت اورفقرو استغنا سے مستحکم ہوتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں انسان کے قبضے میں آجاتی ہیں کیونکہ عشق میں جذبۂ تسخیر، جذبۂ تخلیق اورجذبۂ ارتقاتینوں موجود ہیں اوریہیں سے اقبالؔ کا فلسفۂ عمل بھی شروع ہوتا ہے۔

اقبالؔ کا فلسفۂ زندگی بلندترین مقاصد کی ترجمانی کرتا ہے۔وہ زندگی کوفطرت کا مقصدومنشا سمجھتے ہیں اورانھیں یقین ہے کہ زندگی موت کے ہاتھوں پامال نہیں ہوسکتی بلکہ موت کے ذریعے زندگی کی تجدید ہوتی ہے۔ سرورصاحب اقبالؔ کے یہاں قدم قدم پر بکھری حیرت اورتجسس کورومان اوروجدان کا نام دیتے ہیں اوراسی رومانیت کے حوالے سے ہی حقیقت کا عرفان حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اسی آب ورنگِ شاعری کی وجہ سے اقبالؔ کا فلسفہ حیات حسین معلوم ہوتا ہے۔اپنے دعوے کے ثبوت میں انھوں نے درج ذیل شعر پیش کیے ہیں:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دِلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند
فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے آبلۂ مسجد ہوں ، نہ تہذیب کا فرزند(۱۴)

آج کے دور میں اگر افکارِ اقبال کوعام کرنا ہے تو منطق اورفلسفہ کے دقیق اورپیچیدہ پیرائے کی بجائے سرورصاحب کے اسلوب اوراندازِ بیان کواپنانے کی ضرورت ہے۔

’’رُوحِ اقبال‘‘ یہ مضمون ڈاکٹر یوسف حسین خان کی کتاب ’’رُوحِ اقبال‘‘ پر تبصرہ ہے۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنے مطالعے کی سہولت کے مدِنظر اقبالؔ کے خیالات کوتین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔آرٹ ۲۔تمدن ۳۔مذہب

سرورصاحب نے انھیں تینوں مضامین پر باری باری تبصرہ کیا ہے۔تقریباً چھ صفحات پر آرٹ والے مضمون پر تبصرہ ہے۔دوسرا مضمون پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔تیسرا اورآخری مضمون اقبالؔ کے مذہبی اور مابعدالطبیعاتی تصورات سے متعلق ہے۔اس حصے پر تبصرہ کے لیے صرف ایک صفحہ مختص ہے۔

آل احمد سرور نے اپنی تمام تر ذہنی مناسبت اورعقیدت کے باوجود اقبال کو بت بنا کر پرستش نہیں کی۔ انھیں اقبالؔ سے جہاں اختلاف ہوا ہے وہاں اپنی بے لاگ رائے کا اظہار بھی کردیا ہے۔مثلاً اقبالؔ کا آزادیٔ نسواں کے خلاف ہونا،بعض اوقات سطحی مذہب کی حمایت میں مذہب کی اِنقلابی رُوح کونظرانداز کرنا،مسولینی

سے متاثر ہونا۔شعریت کو جذبے اور فلسفے پر نثار کر دینا وغیرہ۔وہ یوسف حسین خاں سے بھی جن باتوں میں متفق نہیں ہو سکے،ان کا اظہار بھی برملا کیا ہے۔سرور صاحب لکھتے ہیں:

"یوسف صاحب نے اقبال کے چند شاعرانہ موضوعات کا بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے۔ان میں شیطان کا کردار سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔۔۔یوسف صاحب نے یہاں اقبال کے ایک اور دلچسپ موضوع "شاہین" کا ذکر نہیں کیا، جو ان کے آخری دور میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔"(۱۴)

سرور صاحب کہتے ہیں کہ یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اقبال نے غزل اور نظم کے فرق کو کم کیا۔نظموں میں غزلوں کی مستی، رنگینی اور کیف پیدا کیا اور غزلوں سے ہجر و وصال کے بجائے مسائل حیات کی عکاسی کا کام لیا۔یوسف صاحب نے اُردو شعروں کی مثالیں بہت کم دی ہیں، فارسی شعروں کی زیادہ۔ان سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید ان کی اُردو غزلیں گئی گزری ہیں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔

"رُوحِ اقبال" میں تقدیر کی بڑی اچھی توضیح کی گئی ہے۔بقا اور موت پر بھی نہایت سلجھے ہوئے انداز میں تبصرہ ہے لیکن تصوف سے متعلق اقبال کا جو نظریہ ہے اس پر چند اِشاروں پر اِکتفا کیا گیا ہے۔حالانکہ اِس موضوع پر زیادہ تفصیل سے بحث کی ضرورت تھی۔

تبصرہ کرتے ہوئے سرور صاحب نے متوازن انداز میں تصویر کے دونوں رُخ پیش کیے ہیں۔تصنیف کے محاسن بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اِنتہائی عالمانہ انداز میں اختلافی پہلو بھی پیش کیے ہیں۔

"خطوط میں اقبال کی شخصیت" ایک مختصر سا مضمون ہے۔دراصل یہ ایک ریڈیائی تقریر ہے۔سرور صاحب نے بڑی دلچسپ تمہید باندھی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"ادب میں تازگی،ندرت،سچائی اور زندگی شخصیت سے آتی ہے،شخصیت کی گرمی سے بے جان الفاظ منہ سے بولنے لگتے ہیں اور اقبال کے الفاظ میں نالہ نے میں سرورمے اور شیشے کی صراحی میں شمشیر کی تیزی ملنے لگتی ہے۔"(۱۵)

خطوط تو دلی جذبات وخیالات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ان میں خلوص اور صداقت ہوتی ہے۔اشخاص کے مزاج کو سمجھنے کے لیے خطوط کا مطالعہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔اقبال کے حوالے سے سرور صاحب کا خیال ہے:

"اقبال زندگی میں تو اکثر بہکے ہیں مگر خطوں میں اپنے آپ کو لیے دیے رہتے ہیں۔ان کے خطوں میں ذہن کی روشنی ہے۔۔۔اقبال کے خطوں میں ظرافت اور شوخی کم ہے حالانکہ اقبال بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ان سے ان کی زندگی کے واقعات کا زیادہ علم نہیں ہوتا۔۔۔ہاں ان

کی شاعری میں ان کی شخصیت پوری طرح جھلکتی ہے۔اقبال کے سارے خط اگر شائع ہو جائیں
تو وہ ان کی شاعری کی شرح بن سکیں گے۔اس سے زیادہ نہیں۔''(۱٦)

سرور صاحب نے بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ اقبال کو کلامِ اقبال میں تلاش کرنا چاہیے۔انھیں اقبال کے اُن ارشادات پر اعتماد ہے جو شعر میں ہیں۔

''اقبال کے خطوط'' یہ مضمون اُس وقت تحریر کیا گیا جس وقت ابھی اقبال کے خطوط کے مجموعے ''شاد و اقبال''، ''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' اور ''اقبالنامہ'' مرتبہ شیخ عطاءاللہ ہی منظرِ عام پر آئے تھے۔یہ مضمون لکھتے وقت سرور صاحب نے ''اقبالنامہ'' مرتبہ شیخ عطاءاللہ کو پیشِ نظر رکھا ہے اور ان خطوط کی مدد سے نظریہ شعر، تصوف اور سوشلزم وغیرہ کے بارے میں اقبال کے لفظوں میں، اقبال کی نظموں کا منظرنامہ تیار کیا ہے۔

شاد کے نام جو خط ہیں ان سے اقبال کی مشرقیت، وضع داری، محبت، اہل اللہ سے عقیدت اور رُوحانیت ظاہر ہوتی ہے۔ان خطوط کے مطالعہ سے ہم اقبال کی شخصیت کے صرف ایک پہلو سے واقف ہو سکتے ہیں۔۔۔''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' میں جو خطوط شامل ہیں، ان میں اقبال نے اپنے سیاسی شعور کے مطابق ہندوستان کی سیاست اور اس میں مسلمانوں کی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے یعنی یہ دونوں مجموعے صوفی اقبال یا لیڈر اقبال کی نمائندگی کرتے ہیں۔اس اقبال کی نمائندگی نہیں کرتے جو فرشتوں کو آدم کی تڑپ اور آدم کو آدابِ خداوندی سکھاتا ہے، جس کا جنون سستی دیوانگی نہیں۔کمال ہوش مندی سکھاتا ہے۔اس لیے سرور صاحب نے ''اقبالنامہ'' کو پیشِ نظر رکھا۔یہ مجموعہ خطوط زیادہ جامع، اہم اور دلچسپ ہے۔ان خطوط میں اقبال نے زندگی اور ادب کے اکثر بڑے بڑے مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ان سے اقبال کے کلام، ادبی زندگی، مشاغل اور دلچسپیوں سب پر روشنی پڑتی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''اقبال کے خطوط کو پڑھ کر ان کے ذہنی سفر اور ان کے ذہنی ارتقا کی داستان قلمبند کی جا سکتی
ہے۔اقبال کے خطوط ان کی زندگی کا آئینہ ہیں۔''(١٧)

اقبال نے اپنے خطوط کو ادعائیت، اظہارِ فضیلت، عبارت آرائی، تکلف اور تصنع سے پاک رکھا ہے لیکن ان کے خطوط سپاٹ یا بے کیف نہیں ہونے پائے۔ان میں افادیت اور مقصدیت کا رنگ غالب ہے۔اقبال صرف کام کی بات کرنا چاہتے ہیں۔اس کے لیے وہ براہِ راست اور غیر مبہم طرزِ نگارش اختیار کرتے ہیں۔وہ عبارت آرائی اور ادبی رنگ آمیزی سے گریز کرتے ہیں۔سرور صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ان خطوط کی دلچسپی، رنگینی، ظرافت، ادبیت میں نہیں، ان خیالات کی اہمیت اور عظمت میں
مضمر ہے، ان میں اور پوری طرح محسوس کیے ہوئے خیال کا حسن ہے جسے کسی اور حسن کی
ضرورت نہیں۔''(١٨)

''اقبال کی عظمت'' اس مضمون میں آل احمد سرور، اقبال کی عظمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاعری میں عظمت، خیال کی گہرائی سے آتی ہے۔ اقبال کا درجہ اس لحاظ سے اُردو کے تمام شعرا میں نہایت بلند ہے۔'' (۱۹)

''غالب نے اُردو شاعری کو ذہن دیا تو اقبال نے اسے وحدتِ فکر اور ذوقِ یقین دیا۔'' (۲۰)

''اقبال کی شاعری افادیت، حرکت، عمل اور ارضیت کا عہد نامۂ جدید ہے۔ ہاں اس جدید عہد نامے کی عظمت تسلیم کرنے کے لیے کسی مذہبی جنون کی ضرورت نہیں، ادبی نظر درکار ہے۔'' (۲۱)

محولہ بالا قسم کے اقتباسات سے مجموعی طور پر سرور صاحب کی بصیرت واضح ہوتی ہے لیکن اسی مضمون میں کچھ اقتباسات ایسے ہیں جو تضاد بیانیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ سرور صاحب کی عجیب وغریب منطق کی روشنی میں اقبال مغرب کے فکر وعمل سے علاج بھی دریافت کرتے ہیں اور مغرب کی مذمت بھی کرتے ہیں۔ انسانیت کو خانوں میں بند ہونے سے بچاتے بھی ہیں اور رجعت پسند عناصر کو تقویت بھی پہنچاتے ہیں۔ ان باتوں پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال کا منظم ومحیط مطالعہ نہیں کیا۔ اپنے موضوع پر پوری معلومات اور تمام حقائق بہم پہنچا کر کلامِ اقبال کے مختلف پہلوؤں کے درمیان ترتیب تک قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح ہمیں ان کی ذہانت کے چند ریزے تو مل جاتے ہیں مگر موضوع پر تنقید کی مکمل آ گاہی نہیں ہو پاتی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

''اقبال جیسے متنوع اور ہمہ جہت مفکر اور شاعر کی تمام جہات تک رسائی حاصل کرنا اوران کے فکروفن کی رنگارنگی میں ترتیب وتنظیم کی جستجو میں کامیابی حاصل کر لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔۔۔اگر سرور صاحب کے اس نوع کے مضامین کو زمانی ترتیب اور تسلسل کے ساتھ سامنے رکھا جائے تو وہ گتھیاں کھلتی نظر آتی ہیں جن کو ہم اقبال فہمی کے مختلف مراحل کا نام بھی دے سکتے ہیں۔'' (۲۲)

''اُردو غزل: میرؔ سے اقبالؔ تک'' اس مضمون میں میر تقی میرؔ سے لے کر اقبالؔ تک اُردو غزل کے نمایاں اسالیب اور رُجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخری تین صفحات میں اقبالؔ کی غزل پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ایک اہم تنقیدی مطالعہ ہے۔ سرور صاحب نے اپنے موضوع پر پیش کیے گئے نکات کو بڑی چستی کے ساتھ سمیٹ کر ایک معنی خیز رُخ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حالیؔ کے کلام کو جس نے مکمل کیا وہ اقبالؔ ہیں جنھوں نے اوّل تو غزل کو حکیمانہ سنجیدگی عطا کی جس کے لیے وہ غالبؔ کے مرہونِ منت ہیں، دوسرے انھوں نے اسے ایک ایسی شوخی عطا کی

جو محض ایک ذہنی پھلجھڑی نہیں ہے بلکہ جو زندگی کو ایک روشنی اور عظمت عطا کرتی ہے جس سے دلوں کے غنچے ہی کھلتے اور لبوں کی مہر ہی نہیں ٹوٹتی بلکہ رفیع خیالات کے سہارے پوری بساطِ زندگی مائلِ پرواز معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے عقل و عشق جنوں، فقر، ذوق و شوق، نظر و خبر کو شاعرانہ رموز سے زیادہ فلسفیانہ اصطلاحات بنایا۔" (۴۳)

اِس مضمون میں سرور صاحب نے غزل کا ایک وقیع پس منظر تیار کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ حال کی تمام پیش قدمیاں ماضی کے تسلسل میں ہیں لہٰذا مستقبل کی کوئی کوشش پیش رووں سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔

"اقبال اور مغرب" یہ طویل مضمون لکھتے ہوئے سرور صاحب نے دوسرے اقبال شناسوں سے مختلف رویہ اختیار کیا ہے، انھوں نے ایک پٹے ہوئے موضوع میں نیا توازن تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرور صاحب بتاتے ہیں کہ اقبالؔ مغرب کے خوشہ چین بھی ہیں کیونکہ انھوں نے مغربی فلسفیوں اور فن کاروں سے اِستفادہ کیا ہے۔ وہ مغربی تہذیب سے بیزار بھی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب میں بعض ایسی خرابیاں آ گئی ہیں جن پر اقبال کی نظریں ان کے مشرقی ہونے کی وجہ سے گہری پڑتی ہیں۔ مغرب کے مداح اس لیے ہیں کہ وہ مغربی علم و عمل کو اِسلامی علم و عمل کا ایک قدرتی سلسلہ خیال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اقبال کی مشرقیت، مغربیت سے بیزار ہوتے ہوئے بھی اس سے متاثر ہے اور کہیں کہیں اس کی تعریف ہی نہیں کرتی۔ اس کے اثر سے ایک نئی دُنیا کا خواب دیکھتی ہے جس میں نئے جنوں کے لیے، نیا ویرانہ تلاش کیا گیا ہے۔ نئے انسانوں کے لیے تازہ بستیاں بنانے کا جذبہ ملتا ہے۔ اپنی مشرقیت کے باوجود مغرب کے پیدا کیے ہوئے مسائل سے بھی متاثر ہیں۔ وہ قدیم بھی ہیں اور جدید بھی ہیں۔" (۴۴)

"اقبال کے استعارے" اس مضمون میں سرور صاحب نے اقبالؔ کے کلام میں موجود تشبیہات و استعارات کا جلوہ دکھایا ہے اور مشابہتوں و اختلاف کے درمیان کی فضا کے نقش کو اُبھارا ہے۔

سرور صاحب کا کہنا ہے کہ کلام میں تشبیہات و استعارات کے اِستعمال کا مقصد آرائشِ کلام نہیں بلکہ تخلیقِ معانی ہوتا ہے۔ "بانگِ درا" کی پہلی نظم "ہمالہ" سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے فن میں تشبیہ اور استعارات سے بہت زیادہ کام لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نظمیں "ایک آرزو"، "حقیقتِ حسن"، "ماہِ نو"، "خضرِ راہ"، "بزمِ انجم" اور "والدہ مرحومہ کی یاد میں" تشبیہات و استعارات کی اعلیٰ مثالیں پیش کرتی ہیں۔

سیّد عابد علی عابد کا بھی خیال ہے کہ:

"اقبال کے کلام میں اکثر و بیشتر تشبیہات و استعارات کی بہتات ہے اور انھوں نے ان کا استعمال اس خوبی سے کیا ہے کہ ہمیں بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ اقبال تشبیہ و اِستعارہ کا بادشاہ ہے۔" (۴۵)

اس مضمون میں سرور صاحب نے زیادہ تر تشبیہ کی مثالیں دی ہیں، اگر اِس مضمون کا عنوان ''اقبال کی تشبیہات اور استعارے'' ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔

''اقبال اور جمہوریت'' یہ اس مجموعے کا آخری مضمون ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے اقبال کے تصورِ جمہوریت پر روشنی ڈالی ہے۔ سرور صاحب نے ایک نا قابلِ تردید پس منظر تیار کیا ہے۔ اقبال کے ماحول، تعلیم اور قیام یورپ پر روشنی ڈالنے کے بعد فاسٹر کی کتاب (Two Cheers for Democracy) کے ایک کلیدی مضمون (What I believe) کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اِس میں جمہوریت سے متعلق دلچسپ خیالات ملتے ہیں۔

سرور صاحب نے جمہوریت کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کا محاکمہ کرتے ہوئے اقبال کا اُردو کے علاوہ فارسی کلام بھی موقع بہ موقع پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال کی مغرب کے جمہوری نظام کی خامیوں پر نکتہ چینی کے معنی سرے سے جمہوریت کی مخالفت کے نہیں لینے چاہئیں، کیونکہ وہ نہ صرف سلطانی جمہور کا خیر مقدم کرتے ہیں بلکہ مزدور کو یہ بشارت بھی دیتے ہیں کہ شرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے۔ جمہوری اِداروں خصوصاً موجودہ پارلیمانی نظام سے اقبال کی مایوسی مغرب کے علاوہ ہندوستان کے مخصوص حالات کی روشنی میں ہے کیونکہ جمہوری اِداروں کا کوئی بیرونی ڈھانچہ ہندوستان میں کام نہیں دے سکتا۔ ہندوستانی جمہوریت کو اپنے مخصوص حالات کے مطابق جمہوری اِداروں کی تشکیل کرنی چاہیے تا کہ وہ اکثریت اور اقلیت دونوں کی اِصلاح اور فلاح کے ضامن ہوں یہ کام آسان نہ سہی مگر کرنے کا ہے اور کیا جا سکتا ہے۔

الغرض سرور صاحب کا اقبالیاتی سرمایہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے عقیدت مندانِ اقبال کے اس وسیع طبقے پر بڑا احسان کیا ہے جسے اقبال کی تمام تصانیف نظم و نثر پر دسترس نہ تھی۔ محض موضوعات پر نظر ڈالیے تو کتاب کے متنوع مباحث کی نوعیت آشکار ہو جاتی ہے۔ ان کا یہ کام نئی نسل کے اقبال شناسوں کے لیے مشعلِ راہ ہے اور بلا شک و شبہ ان کی اس کاوش کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہے گا۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سپوتنک (ماہنامہ)، سرور ادبی نمبر، جلد۱۳، شمارہ۵، لاہور، مئی ۲۰۰۲ء، ص۱۲۰

(۲) ایضاً، ص۱۲۱

(۳) آل احمد سرور، عرفان اقبال، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص۱۷

(۴) آل احمد سرور، اقبال اور اُن کا فلسفہ، مرتب: صدیق جاوید، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۶

(۵) آل احمد سرور، عرفان اقبال، ص۲۲

(۶) ایضاً، ص۲۸

(۷) عطاء اللہ، شیخ، اقبالنامہ، ص۵۸۰

(۸) آل احمد سرور، عرفان اقبال، ص۴۰

(۹) ایضاً، ص۶۸

(۱۰) ایضاً، ص۷۱

(۱۱) ایضاً، ص۷۲۔۷۳

(۱۲) ایضاً، ص۷۸

(۱۳) اقبال، کلیاتِ اُردو، ص۳۵۷

(۱۴) آل احمد سرور، عرفان اقبال، ص۱۱۳

(۱۵) ایضاً، ص۱۲۱

(۱۶) ایضاً، ص۱۴۳۔۱۴۴

(۱۷) جمیل جالبی، ڈاکٹر، خطوط اقبال کی اہمیت، بشمولہ: اقبال دورِ جدید کی آواز، مؤلفہ: سلطانہ مہر، ص۲۰

(۱۸) آل احمد سرور، عرفان اقبال، ص۱۴۲

(۱۹) ایضاً، ص۱۴۳

(۲۰) ایضاً، ص۱۶۴

(۲۱) ایضاً، ص۱۵۴

(۲۲) ابوالکلام قاسمی، پروفیسر، اقبال تنقید اور آل احمد سرور، بشمولہ: فکر ونظر (سرور نمبر) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
نومبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۳

(۲۳) آل احمد سرور، عرفان اقبال، ص ۱۷۱

(۲۴) ایضاً، ص ۱۹۳

(۲۵) عابد علی عابد، سیّد، ''شعر اقبال''، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۳۲